"نذرِ خلوص"

جنابِ محترم

مظہر امام صاحب

کی خدمت میں!

مخلص

اشفاق انجم

۱۶ رجولائی ۷۹ء

"کتاب سے متعلق اپنی رائے سے نوازیے گا۔"

Ashfaque Anjum

M.A. B.Ed.

749, Nayapura

MALEGAON (Nasik)

یہ کتاب مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے
سایہ
سایہ
دھوپ
K. DARAKHSHAN
محمد
اشفاق

انتساب

والدِ محترم

جلیل احمد محمد یوسف صاحب

کے نام

جن کے فیضِ تربیت نے میری زندگی سنوار دی

مُصنِّف

نام : اشفاق احمد

تخلص : انجم

ولدیت : جلیل احمد محمد یوسف

تاریخِ پیدائش : یکم جون ۱۹۴۸ء

تعلیم : ایم، اے، بی، ایڈ

ریسرچ اسکالر گجرات یونیورسٹی (احمد آباد) بموضوع "شعرائے مالیگاؤں"

تلمذ : شاعرِ حیات حضرتِ ادیب صاحب مالیگانوی

جائے سکونت : ۷-۹۴ نیا پورہ، مالیگاؤں

میں نے جو کچھ بھی دیکھا، سوچا اور محسوس کیا ہے
سایہ، سایہ، دھوپ
اس کا سچا اظہار ہے

میں اس کتاب کو اس اعتماد کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ
اِس میں جو کچھ ہے
میرا اپنا ہے
میری اپنی ذات کا آئینہ ہے
جس میں آپ مجھے بھی دیکھ سکتے ہیں اور
خود کو بھی

اشفاق انجم

نام کتاب : سایہ سایہ دھوپ
مصنّف : اشفاق انجم
کتابت : غیاث الرحمٰن
طباعت : عوامی پریس مالیگاؤں
ٹائٹل : رشید آرٹسٹ مالیگاؤں
تعدادِ اشاعت : ایک ہزار (بارِ اوّل)
سنہ اشاعت : سنہ ۱۹۷۹ء
قیمت : دس روپے
ناشر : اشفاق انجم، ۹۴۷۔ نیاپورہ، مالیگاؤں

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی، ممبئی، علی گڑھ
اطفال بک ڈپو۔ محمد علی روڈ، مالیگاؤں
اشفاق انجم۔ ۹۴۷، نیاپورہ، مالیگاؤں

حرفِ محرمانہ

آذیب مالیگانوی

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

اور زمانے کا یہ انتظار رائیگاں نہیں جاتا۔ پردۂ عدم میں جو کچھ ہے وہ ایک ترتیب و تسلسل کے ساتھ منصۂ شہود پر رونما ہوتا رہتا ہے۔ زمانے کی صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث کا ظہور ہوتا ہے، اور تسبیح روز و شب کا دانہ دانہ شمار کرنے والا اس تماشے کو ابدی بناتا رہتا ہے۔

کاروانِ حیات کبھی ایک منزل اور ایک مقام پر ٹھہر نہیں سکتا۔ انسانی زندگی ازل سے جدّت پسند، تنوّع پسند اور ارتقا پسند رہی ہے۔ پسند کا یہ سلسلہ زندگی کے تمام شعبوں میں جاری و ساری ہے۔ مذہب و سیاست، فکر و فن، شعر و ادب اور دوسرے تمام گوشے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ادب، زندگی اور سماج سے الگ کبھی کوئی چیز نہیں رہا۔ اعلیٰ ادب ہو یا پست، سب زندگی کے اسالیب و انداز کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ولی سے لے کر حالی تک اردو شعر و ادب کا جو رنگ ڈھنگ رہا ہے اس کو اربابِ نظر اور نقادانِ فن جانتے ہیں۔ حالی نے اس ادبی پستی کو نہایت دردمندانہ طور پر ہدفِ طعن بنایا، اور خود وہ کر کے دکھایا جو دوسروں سے ممکن نہ تھا۔

اس کے بعد ۱۹۳۶ء تک روایتی شاعری عام رہی ہے۔ اگرچہ اکبر، اقبال، ظفر علی خاں اور دوسرے مشاہیرِ ادب بھی اپنی اپنی آوازیں بلند کرتے رہتے تھے۔ اُدھر شعرِ مہذّب کا سلسلہ بھی سیماب کے گھر سے چل پڑا تھا۔ پھر بھی زُلف و رُخ اور گُل و بلبل والی شاعری نیک نام نہ تھی۔

مغربی ادب کا مطالعہ کر کے باہر سے آنے والوں نے ترقی پسند ادب کے نام سے ایک انقلاب آفریں ہنگامے کا آغاز کیا، اور اس میدان میں ایسا کام کر دکھایا جو وقت اور سماج کے تقاضوں کے پیشِ نظر ضروری اور فطری تھا۔ ترقی پسندی کی رَو نرم خرام ہوئی تو جدید شاعری کا سیلِ رواں جاری ہوا، اور اس سیلاب میں حوصلہ شناوری دکھانے والوں کی تعداد دیکھتے دیکھتے ترقی پسندوں پر چھا گئی۔ اشفاق انجم انھیں باموجشں در آویز والوں میں سے ایک ہیں۔

اشفاق نے جدید شاعری میں بہت جلد اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے، اس لئے کہ وہ تعلیم و تربیت دونوں سے آراستہ ہیں۔

اشفاق نے ایک غزل مجھے اصلاح کے لئے دی۔ میں نے غزل کو دیکھے بغیر پھونک کر واپس کر دیا۔ اس پھونک کا چرچا اخبارات میں اور لوگوں میں دور و نزدیک ہوا۔ بعض خوش فہموں نے اس کو آدیب مالیگانوی کی کرامت سے یاد کیا۔ بعض نے مجھ سے وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا، اشفاق تعلیم یافتہ شاعر ہے۔ بڑی حد تک عیب و نقص سے پاک شعر کہتا ہے۔ غزل کا کاغذ پھونک کر واپس کر دینا اس اعتماد کو ظاہر کرتا ہے جو غزل دیکھنے والے کو غزل دکھانے والے پر ہے۔ بات ختم۔

سایہ سایہ دھوپ اشفاق کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ آپ خود ملاحظہ فرما کر تصدیق کر لیں کہ اشفاق کہاں تک قابلِ اعتماد شاعر ہے۔ اس کے مجموعہ کے چند اشعار جو سرسری

ملاحظہ سے مل گئے ہیں، یہ ہیں - ایسے کتنے ہی اشعار اِن اوراق میں اہلِ ذوق کا دامنِ دل کھینچنے والے ملیں گے۔ یہ آپ کے ادبی ذوق اور معیارِ سخن پر منحصر ہے۔

انصاف شرط ہے۔

اشعار

دے کے چبھتے ہوئے سوال ہوا
لے گئی میرے تیس سال ہوا

سایہ سایہ لپک رہی ہے دھوپ
جانے کیا بات ہونے والی ہے

نیند کیا شئے تھی شعر کے آگے
دام اچھے تھے بیچ ڈالی ہے

ہاتھوں میں آ کے کتنے ہی موتی نکل گئے
میں ڈھونڈتا ہی رہ گیا ہیرے جواہرات

انجم کہاں جلاتے ہو شعروں کی مشعلیں
اندھوں کا دیش اور یہ شہرِ تخیلات

سبھی ہیں اُلجھے ہوئے اپنی ذات میں انجم
تمہیں بتاؤ تمہیں کون آسرا دے گا

بارش نہ سہی ابر کا سایہ بھی بہت ہے
صحرا سے سمندر کا یہ رشتہ بھی بہت ہے

اک روپ میں ڈھلنے کیلئے صدیاں بھی کم ہیں
ذہنوں میں سما جائے تو لمحہ بھی بہت ہے

زرد پتوں پہ مرا نام لکھا ہے اُس نے
سبز خوابوں کا یہ انجام لکھا ہے اُس نے

سر اُچھلتے ہیں زباں کٹتی ہے جس میں انجم
میرے ذمے وہی اک کام لکھا ہے اُس نے

زرد موسم کے اک شجر جیسی
ساری بستی ہے میرے گھر جیسی

زندگی آج کے زمانے میں
بحرِ ظلمات کے سفر جیسی

اِعترافِ

بشر نواز

شاعری شخصیت کے اظہار کا راست یا غیر راست ذریعہ ہے۔ الفاظ کے پردے میں وہ ذہن جھلک دکھاتا ہے جو کسی مخصوص دائرۂ وقت، ماحول اور سیاق و سباق میں زندگی کرنے والے فرد سے متعلق ہو۔ وقت، ماحول اور فرد اپنے خصوصی اوصاف کے باوجود ایک تسلسل کا جزو ہوتے ہیں۔ اِس طرح ایک فرد یا وقت کا ایک خاص حصّہ اپنے آپ میں منفرد بھی ہوتا ہے اور عمومی بھی۔ زندگی کی یہ کیفیت جب فن میں راہ پاتی ہے تو کوئی فنکار اپنے دَور کا عکاس ہوتے ہوئے بھی ماضی کا امین اور مستقبل کا ضامن بن جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی تیز رفتاری اور ژرف نگاہی نے بظاہر یوں لگتا ہے کہ اِس تسلسل کو بڑی حد تک معطّل اور ظاہری مماثلتوں کو معزول کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اُس کی تاگزیر تبدیلیوں کو سطحی نظر سے دیکھنے والے اکثر مغالطے میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک لامتناہی سلسلے کا جزو سمجھنے کی بجائے نقطہ، جزیرہ یا قطعۂ وقت فرض کر لیتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر ان کا فن زمان و مکان کی قیود میں گھُٹ کے رہ جاتا ہے اور وقت کے سیل سے نبرد آزما ہو کر سرافراز ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ ہمارے اپنے دَور کے بہت سارے لکھنے والے اِس المیے کا شکار یوں ہوئے کہ وہ بیسویں صدی میں سانس تو لے رہے تھے لیکن اُس بصیرت سے محروم تھے جو آج کے مسائل کو سمجھنے کے لئے شرطِ اوّل ہے۔ ہمارے دَور میں اشیاء، واقعات اور صورتوں کی تبدیلی روز کا مشاہدہ بن چکی ہے۔ سائنس کی تیز رفتاری نے اس عمل میں مزید شدّت اور تندی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو تبدیلیوں کے اندرونی رشتوں تک پہنچنے کی سکت نہیں رکھتے

ظواہر کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اُس سے ہم آہنگ کرنے کی دُھن میں محض فنّی ہیئتوں، لفظوں اور کچھ تراکیب کے اُلٹ پھیر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جس کے نتیجے کے طور پر فن میں ہیئت پرستی کا زور بڑھنے لگتا ہے، اور چند مخصوص علامتیں، پیکر اور الفاظ مقصود بالذات بن جاتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ دہے میں اُردو کے بہت سارے نوجوان لکھنے والے، فنکاری کے منصب سے اُتر کر محض کرتب بازی پر قانع ہو گئے۔ اِس ماحول میں جب کوئی آواز صورتوں اور ہیئتوں کی نفی کرتے ہوئے اوصاف پر اصرار کرتی ہے تو قاری چونکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جب میری نظر سے اشفاق انجم کا یہ شعر گذرا کہ

اپنی پہچان کے اوصاف مقرّر کر لو!

یہ صدی روز تمہیں اک نئی صورت دے گی

تو حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ حیرت یوں کہ یہ لہجہ انجم کے ہم عمر لکھنے والوں سے کافی الگ تھا، اور مسرت یوں کہ اِس شعر کا خالق عصری شعور بھی رکھتا ہے۔ اپنی شخصیت بھی اور اس کے اظہار پر قدرت بھی۔ وقت کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے رنگوں میں حقیقت کو پہچاننا اِس لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم حقیقت کو ایک غیر نامیاتی، غیر متبدّل اور جامد شکل مان کر چلتے ہیں اور اِس سچّائی کو بھول جاتے ہیں کہ حقائق اپنی تبدیل شدہ اشکال کے باوجود اپنے اوصاف میں ثابت قائم رہتی ہیں اور یہی پہچان کا ذریعہ ٹھہرا ہے۔

یہ شعر اشفاق انجم کے نظریۂ فن اور رویّۂ حیات دونوں سے تعارف کروانے کے لئے کافی ہے۔ نظریۂ فن ہو کہ رویّۂ حیات، شاعر کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں، اس لئے ہم شعر کے آئینے میں فنکار کے خدو خال بھی دیکھ سکتے ہیں۔

اشفاق انجم نے اپنے بہت سارے ہم عصروں کے برخلاف شاعری کو ذہنی ورزش، لفظی بازیگری اور مروّجہ اظہارات کی بھینٹ نہیں چڑھایا بلکہ اپنے تجربے کو احساس اور احساس کو شعر میں ڈھالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے کسی شعر میں کوئی پیکر، علامت، ترکیب اور چونکا دینے والا لفظ

کلیدی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ تجربے کی صداقت اور اظہار کی طاقت مل کر قاری کو اُن دُنیاؤں کی سیر کرواتے ہیں جو شاعر اور قاری دونوں میں مشترک ہیں۔ وجہ اِس اشتراک کی یہ ہے کہ شاعر نے اپنے آپ کو منفرد ثابت کرنے کے لئے جیتی جاگتی دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کی اور نہ لہجہ بنانے کی دُھن میں مصنوعی طرزِ اظہار کا شکار ہوا بلکہ شاید شعوری طور پر اس سے مختلف راہ اختیار کی اور اپنے آپ سے صادق رہتے ہوئے پوری توجہ اپنی ذات اور محسوسہ تجربے پر مرکوز رکھی۔

انجم کی شاعری الگ الگ اور مختلف النوع ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک تسلسل کا مختلف صورتوں میں اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ایک متحرک کردار ملتا ہے جس کی پہچان کے لئے ہمیں صورت سے زیادہ صفت پر توجہ دینی پڑے گی۔ یہاں صورت سے میری مراد شعری ہیئت اور اس کی تشکیل کرنے والے عناصر ہیں۔ اور صفت موضوع، مواد اور تجربے کی نوعیت کا اشاریہ ہے۔ یہ کردار موجودہ عہد کے ایک ایسے باشعور اور حساس نوجوان کی نمایندگی کرتا ہے جو لمحۂ موجود کا اسیر بھی ہے اور اس سے آزاد ہونے کے لئے کوشاں بھی۔ آزاد ہونے کی اس کوشش میں وہ ماضی کے تجربے سے قوت حاصل کرتا ہے اور ساتھ ہی اسے اپنے دَور سے ہم آہنگ کرنے کی جدّوجہد بھی۔ چنانچہ اس کی شاعری میں روایت ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے جو محض ہیئتی تجربے یا لسانی توڑ پھوڑ سے قطعی مختلف، اور اپنے عصر کی خوبیوں اور خرابیوں، صداقتوں اور مفروضوں کی پہچان ہے ۔

دم بہ دم خوں کی روانی میں بھنور پڑتے ہیں	ایسا لگتا ہے کوئی سخت گھڑی آئے گی
پرچھائیں سے بھی اپنی ابھی ڈر رہا ہوں میں	انجان راستوں پہ سفر کر رہا ہوں میں
دیکھا ہے کس نے وقت گذرتا ہے کس طرح	لیکن وہ چھوڑ جاتا ہے چہروں پہ داستاں

اِن اشعار میں وقت کا احساس بھی ہے، آج کی ننگی حقیقتوں کا اِدراک بھی، اور اپنے دَور کی بے یقینی، خوف اور شک بھی۔ وقت کے وجود کا احساس شاعر کے ذہن کو اُن ادوار و اشخاص کی طرف پھیر دیتا ہے جو ایسی ہی سخت منزلوں سے گذر چکے ہیں ۔

اک اور تماشہ چلو دنیا کو دکھا دیں　　　مدت سے صلیبوں کا تقاضا بھی بہت ہے

بیتے ہوئے لمحوں سے ملاقات اگر ہو　　　لے آنا ہوا ؤ ذرا اک بار مرے گھر

آنکھوں کو پھوڑ لیں گے وہ خود اپنے ہاتھ سے　　　یارو پرانے لوگ جو زندہ کئے گئے

عصری تہذیب کے تضادات اور زندگی کی رزم گاہ میں خواب و حقیقت کا تصادم نہ اس میں مایوسی و جھنجھلاہٹ پیدا کرتا ہے، نہ اس کے لہجے کو زہریلا، کرخت اور ناہموار بناتا ہے بلکہ درد اور تاسّف کی ایک ایسی لہر دھیرے دھیرے الفاظ کا روپ دھارنے لگتی ہے جس میں اُس اعتماد کا رنگ بھی شامل ہے جو زندگی کے تسلسل پر یقین کی دین ہے اور اُس شخصیت کا عکس بھی جو آج کے مسائل و معائب کا ادراک رکھتی ہے۔

تلمیحات کی طرف غیر معمولی رغبت اور اسی کے ساتھ نئے ذرائع اظہار کی تلاش میں نظر آنے والا ظاہرا تضاد دراصل اُسی کردار کے سچّے اظہار کا پیدا کردہ ہے جس کے قدم حقائق کی سنگلاخ زمین پر اور جس کے رشتے ماضی کی یادوں سے جڑے ہوئے ہیں ؎

سُرخ تھے چہرے بدن شاداب تھے　　　یہ ابھی دو چار دن کی بات ہے

وہ دن بھی کیا عجیب تھے جب اس کے واسطے　　　پت جھڑ میں بھی بہار کا منظر رہا ہوں میں

یہ فقط ماضی کی یادیں ہی نہیں ہیں ان کے پس منظر میں حال کی نامرادیوں کا نوحہ بھی سنائی دیتا ہے۔

اشفاق انجم کا شعری کردار کبھی دورِ گذشتہ کے ہیروز کو مثالی کردار مان کر ان سے قوت حاصل کر کے زندگی سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے اور حال کی ناکامی کا ازالہ کر کے اپنے آپکو سہارا دیتا ہے ؎

ہے یقیں مجھ کو مرے خوں کی قیمت دے گی　　　یہ شہادت مری اس دور کو عزت دے گی

اور کبھی اپنی شخصیت کے کس بل پر یہ ہفت خواں طے کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ مجھے اس رویّے میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا، کیونکہ بقولِ وزیر آغا "شخصیت کی تشکیل و ترتیب میں روایت اور ماحول کے جملہ عناصر شریک ہوتے ہیں۔ یوں خود شخصیت بھی محض لاشعوری اور طبعی رجحانات کے اجتماع کا نام نہیں بلکہ اُس سمجھوتے کی ایک صورت ہے جو لاشعوری تحریکات اور خارجی زندگی کے مظاہر میں تصادم و آویزش سے

وجود میں آتا ہے۔"

انجم کے فن میں یہ سمجھوتہ، ہیئت کی شکل میں بھی نظر آتا ہے اور واقعات کے ردِ عمل کی صورت میں بھی۔ اور اس کی نوعیت اُس غیر شخصی اظہار کی سی ہوتی ہے جس کی طرف ٹی۔ ایس ایلیٹ نے اشارہ کیا تھا۔ اس غیر شخصی طرزِ اظہار کی وجہ سے انجم واقعات و حادثات پر ناقدانہ نظر ڈالنے اور فنی توازن کو برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور تجربے کے اُس بے محابا اظہار سے بچ جاتے ہیں جس کی وجہ سے کچھ لکھنے والے وقتی ہنگامہ آرائی اور کچھ حضرات مروجہ ادبی فیشنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جب تجربہ، شخصیت، عصری آگہی اور فن کی تنگناؤں سے گذرتا ہے تو اکثر رسمیت کا شکار ہو جاتا ہے یا اپنی اصل سے کٹ کر ہیئت پرستی کی مثال بن جاتا ہے۔ اس فنی پل صراط سے صرف وہی فنکار پار اُترتے ہیں جن میں اپنے تجربے کو صادق اظہار میں ڈھالنے کی سکت ہوتی ہے۔ ایسے فنکاروں کے ہاں عصری سند یافتہ لوازماتِ شعری کی تلاش کئی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اشفاق انجم سچے اظہار کا شاعر ہے، اسی لئے اس کی شعری زبان اور دیگر ذرائع اظہار اس کے اپنے ہیں۔ انجم کے ہاں غیر ضروری ابہام کی جگہ معنوی تہہ داری اور پیچیدہ ہیئت کی جگہ راست پھٹ پڑنے والی کیفیت نمایاں ہے۔ اس کا لہجہ کرخت نہ ہوتے ہوئے بھی ملائم و نرم و نازک نہیں ہے بلکہ اس میں گوارہ صلابت پائی جاتی ہے۔ خارج اور داخل کی ہم آہنگی کی وجہ سے اکثر اوقات بیرونی مناظر، موسم اور پیکر اندرونی احساسات و جذبات کے علامئے بن جاتے ہیں، اور کبھی آگے بڑھ کر شخصی جذبہ، غیر شخصی بلکہ بے جان و جامد مظاہر میں ڈھل کر انھیں بھی متحرک و زندگی آشنا بنا دیتا ہے ۔

مرے وجود نے کیا کیا لباس بدلے ہیں	کہیں چراغ کہیں راستے کا پتھر ہوں
اب زرد لبادے بھی نہیں خشک شجر پر	جس سمت نظر اُٹھتی ہے بے رنگ ہے منظر

یہ فقط منظر ہی نہیں بلکہ شاعر اور اُس کے عہد کی داستان بھی ہے اور اس داستان کے کردار ہم آپ ہیں جنہیں شاعر نے کبھی خشک شجر کی شکل، کبھی زرد لبادے اوڑھے ہوئے، کبھی چراغ کے رُوپ میں اور کبھی

راستے کے پتھر کی شکل میں دیکھا ہے۔ آج کے عہد کے مضمرات کو فطرت کے توسط یا تقابل سے سمجھنے کی کوشش

دراصل اس بات کا اشاریہ ہے کہ ابھی انسان نے اپنا کچھ نہ کچھ فطری پن بچا رکھا ہے۔

سورج، درخت، پتے اور اسی قسم کی دوسری اشیاء اپنی صفات کی وجہ سے کبھی

شاعر کا نعم البدل اور کبھی اس کی مخصوص کیفیات کی علامت بن جاتی ہیں ۔

شام ہوتے ہی سمندر میں اُتر جاتا ہے
کیسا سورج ہے اندھیروں کے نگر جاتا ہے

ستارہ کوئی جبیں پر سجا لو دیوانو
اندھیرے غاروں میں جینے کا حوصلہ دیگا

کشتیاں ساحلوں کی فکر میں گم
اور ہوا بادباں سے ناواقف

اگر ہم سورج کو دن بھر محنت کرنے والے کلرک یا مزدور کا علامیہ سمجھیں اور اندھیروں کے نگر غریب بستیاں مان لیں تو.... اسی طرح کیا دوسرے اور تیسرے شعر میں ستارہ، عقیدے اور غار وقت کا علامیہ نہیں بنتا، کشتیاں ہماری اور ہوا وقت کی نمائندگی نہیں کرتی ؟ یہ علامتیں اور پیکر سوچے ہوئے نہیں محسوس کئے ہوئے ہیں۔ اس ربط کے پیچھے ذہن سے زیادہ احساس کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور سوچنے سے زیادہ محسوس کرنے یا سوچ کو احساس بنا سکنے کا یہی رویّہ جب اپنا اظہار چاہتا ہے، تو شاعر کو کسی علامت، پیکر، مروّجہ محاورے کے لئے تگ و دو نہیں کرنی پڑتی بلکہ یہ سب ایک فطری انداز میں ڈھل کر اجنبی ہوتے ہوئے بھی جانے پہچانے اور محض ایک فرد یعنی شاعر کا تجربہ ہوتے ہوئے بھی سب کا تجربہ بن جاتے ہیں اور یہیں سے اچھی اور ہم عصر شاعری کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اشفاق انجم کا یہ مجموعہ آج کی شاعری کو فیشن کی عینک سے دیکھنے والے حضرات کو چھوڑ کر ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اس آئینے میں گذشتہ دہے کی اردو شاعری کے خد و خال نمایاں نظر آئیں گے۔

○

سایہ سایہ لپک رہی ہے دُھوپ
جانے کیا بات ہونے والی ہے

میں کیا بتاؤں کہ وہ مہرباں کتنا ہے
شکستہ، کفر کا ورنہ مکاں کتنا ہے

اُسی کے فیض نے بخشی ہیں عظمتیں سب کو
زمیں کی بات ہے کیا آسماں کتنا ہے

فصیحِ سنگ ہیں اُمّیؐ کے آستانے پر
وہ کم سخن سہی، معجز بیاں کتنا ہے

سیاہ کملی کے سائے میں متقی ہی نہیں
ہم عاصیوں کا بھی وہ پاسباں کتنا ہے

ہمارے جسم کو انجمؔ عذاب ترسے گا
یقیں سے پوچھ ہمارا گماں کتنا ہے

○

دریا عاجز ہے ابر خالی ہے
ہر صدف کاسۂ سوالی ہے

سایہ سایہ لپک رہی ہے دھوپ
جانے کیا بات ہونے والی ہے

آنکھ میں بھی نمی نہیں یارب
کس قیامت کی خشک سالی ہے

چند سانسوں کے ساتھ نکلا ہوں
میرا رختِ سفر مثالی ہے

نیند کیا شے تھی شعر کے آگے
دام اچھے تھے بیچ ڈالی ہے

کچھ تو بے راہ رو ہوئی دھرتی
زلزلہ کیسا؟ گوشمالی ہے

کم ہیں انجم سے اہلِ فن، لیکن
یہ بھی کم بخت لااُبالی ہے

یاروں کو میرے قتل سے راحت بہت ملی
میں خوش ہوں میرے خون کی قیمت بہت ملی

پانی بغیر بیج میں کونپل نہ لا سکے
ہر چند کائنات پہ قدرت بہت ملی

جب تک چلا عصائے انا ٹیکتا ہوا
دشنامِ راہ، گردِ ملامت بہت ملی

ہاتھوں پہ مرنے والوں کے لکھ دینا چاہئے
کم تھے ذریعے اور ضرورت بہت ملی

کس کو بتاؤں رات کی نیندیں حرام ہیں
دنیا کو رشک ہے مجھے دولت بہت ملی

اُس کا خیال تھا جو پریشاں کیے رہا
ورنہ شبِ فراق میں لذت بہت ملی

☆

چاند روزِ ابتدا سے زرد ہے
یہ بھی شاید میرے گھر کا فرد ہے

گذری صُبحوں سے ہمیں نسبت نہیں
آنے والی دوپہر کا درد ہے

اس قدر رنگینیوں کے باوجود!
جانے کیوں آنکھوں میں اتنا درد ہے

ایک شعلہ، روشنی کے نام پر!
رات گمراہی کی بے حد سرد ہے

جس کی اُنگلی پر لکھا تھا معجزہ
سارا عالم اُس کے آگے گرد ہے

رُوح کو چمکائیے انجم میاں
جسم تو بس راستے کی گرد ہے

★

تم کو بھی خواب دِکھاتا ہے مکاں؟
یا فقط مجھ کو ستاتا ہے مکاں

میں تھکا ماندہ پہنچتا ہوں اگر
لوریاں دیکے سُلاتا ہے مکاں

گھر کو جاتے ہیں سبھی شام ڈھلے
بس مجھے آنکھ دِکھاتا ہے مکاں

بھیگ جاتا ہے پسینے سے بدن

وہ سوالات اٹھاتا ہے مکاں

صبح سج دھج کے نکلتے ہیں سبھی

شام، آئینہ دِکھاتا ہے مکاں

جب کھنکتے ہیں کچن میں برتن!

سوندھی خوشبو میں نہاتا ہے مکاں

ہم کو بہلاتے ہو انجم صاحب

یُوں کوئی چھوڑ کے جاتا ہے مکاں

○

شہر میرا حجرۂ آفات ہے
سر پہ سورج اور گھر میں رات ہے

سُرخ تھے چہرے بدن شاداب تھے
یہ ابھی دو چار دن کی بات ہے

پھوٹنے ہی والا ہے چشمہ یہاں
ساری دُنیا عرصۂ عرفات ہے

وہ تو ہے بے چین ملنے کے لئے
درمیاں خود میری اپنی ذات ہے

میں ہوں انجم آفتابِ نیم شب
مجھ سے برگشتہ اندھیری رات ہے

★

دھوپ چڑھتی چلی آتی ہے بچالو مجھ کو
اپنے پیکر میں ذرا دیر چھپالو مجھ کو

کب تلک ساتھ نبھائے گا یہ مٹی کا بدن
پھر نہیں آؤں گا آنکھوں میں بسالو مجھ کو

زندگی ہے تو بہر طور گذر جائے گی!
کیوں ستاتے ہو پریشاں سوالو مجھ کو

پیار کرتا کوئی مجھ سے تو سنورتا میں بھی
اتنا رسوا نہ کرو آئینہ والو مجھ کو

میں یہاں آیا ہوں تہذیب کا پیکر بن کر
گر سنبھلنا ہے تمہیں پہلے سنبھالو مجھ کو

کھل کے ڈالی پہ بکھر جاؤں یہ اچھا تو نہیں
کیا یہ ممکن نہیں زلفوں میں سجالو مجھ کو

★

ہر صحیفے سے یہی ایک جواب آتا ہے
جسم سجتے ہیں تو رُوحوں پہ عذاب آتا ہے

تھک کے سو جاتے ہیں مہتاب کی بانہوں میں سبھی
شام ڈھلتے ہی مرا وقتِ حساب آتا ہے

سینکڑوں سانپ ہیں صندل کے شجر سے لپٹے
آنکھ لگتی ہے تو اکثر یہی خواب آتا ہے

توڑ دیئے اپنے ہی بازو سے فصیلِ شبِ غم
اب کہاں دشت میں آقائے تراب آتا ہے

آج تک پا نہ سکا قیدِ عناصر سے نجات!
پھر بھی انسان کو افلاک کا خواب آتا ہے

اپنے فنکار کی خوشبو میں بسا لو خود کو!
شاخ پر صدیوں میں اک ایسا گلاب آتا ہے

کالے اوہام سے پسپائی کا ثمرہ انجم!
لہلہاتے ہوئے پیپل پہ عذاب آتا ہے

چڑھتے سورج کا یہ اثر ہے میاں
ہر کوئی سوختہ جگر ہے میاں

چپ ہیں انسان سنگ بولتے ہیں
کس مسیحا کا یہ نگر ہے میاں

زندگی بن گئی ہے کٹھ پتلی
دنیا کا ہے کو ناچ گھر ہے میاں

خواہشوں سے لہولہان بدن

یہ تماشا نگر نگر ہے میاں!

کچھ نہ پاؤ گے تلخیوں کے سوا

آرزو نیم کا شجر ہے میاں

اِس میں اُس کی بھی کچھ شرارت ہے

ٹیڑھی بانکی جو رہ گذر ہے میاں

نور اپنا سنبھال لئے انجم

آگے تاریک تر سفر ہے میاں

○

اِسی بہانے سبھی بستیاں سنورنے دے
ترا وجود بِکھرتا ہے گر بِکھرنے دے

سجیلے جسم سبھی کھوکھلے ملیں گے تجھے
یہ رنگ رنگ کی پوشاک تو اُترنے دے

میں ایک قطرہ ہوں یا ہوں سمندروں کیطرح
ذرا "وجود" پہ اپنے نگاہ کرنے دے

رُخِ حیات ہے بے رنگ اس کی فکر نہیں

مجھے خلاؤں کی وسعت میں رنگ بھرنے دے

ہر ایک ذرّے سے سورج کا رنگ جھلکے گا

اندھیرے گھر میں ذرا روشنی گذرنے دے

مزاج پھر سے بگڑنے لگا ہے یاروں کا

ترے شباب کی خوشبو ذرا بکھرنے دے

مرے خیال کی وحشت کو دیکھنا انجمؔ

سجیلی راہ پہ آہٹ کوئی اُبھرنے دے

چاندنی رات بھی جب شعلۂ تر لگتی ہے
تتلیوں کو اسی موسم میں نظر لگتی ہے

ہونے ہی والا ہے کانٹوں پہ بھی شبنم کا نزول
یہ سحر میرے ہی خوابوں کی سحر لگتی ہے

دوستو! سچ کہو دیوانہ کہو گے مجھکو
زندگی، آج مجھے ریت کا گھر لگتی ہے

بڑھتی ہی جاتی ہے ظلمت کا پھریرا لے کر
رات سورج ہی کے مانند نڈر لگتی ہے۔

آسمانوں سے نہیں ٹوٹی تباہی ہم پر
یہ مجھے اپنی ہی غفلت کا ثمر لگتی ہے

جانے کیا بات۔ ہے اک راہِ صداقت کے سوا
آج ہر راہ گذر، راہ گذر لگتی ہے!

★

○

اگر ہوا و ہوس سے گذر گئے ہوتے
ہم اپنی ذات میں کب کے اُتر گئے ہوتے

یقیں جو ہوتا کہ آگے بڑا اندھیرا ہے
حیات بانٹنے والے بھی مر گئے ہوتے

بگاڑا چہرہ تو آنکھیں سنوار دیں اُس نے
ہم اُس کی ذات سے ورنہ نکھر گئے ہوتے

نہ ہوتی ان میں جو خوشبو ترے بدن جیسی
ہمارے شعر بیاضوں میں مر گئے ہوتے

ہمارے ساتھ نکلتے جو آپ بھی گھر سے
دمکتی دھوپ میں انجمؔ نکھر گئے ہوتے

★

○

دے کے پھٹتے ہوئے سوال ہوا
لے گئی میرے تیس سال ہوا

پاؤں دھرتی سے اُٹھ رہے ہیں مرے
ہو سکے تو مجھے سنبھال ہوا

اور پھونکے گا بستیاں کتنی
آگ سے تیرا اتّصال ہوا

تو کہ جلتے دِیے بُجھاتی ہے
میرے زخموں کا اِندمال ہوا

وہ تو کہیے کہ تیرا جسم نہیں
تُو بھی ہو جاتی پائمال ہوا

لوحِ مرقد پہ آبِ زر سے لکھو
ہو گئی ہے یہاں نِڈھال ہوا

ہر قدم دیکھ بھال کر انجم
بُن رہی ہے انوکھے جال ہوا

○

○

اب بھی سجائے جاتے ہیں نیزوں پہ ایسے ہات
سہمی ہوئی سی رہتی ہے جن سے سیاہ رات

ہاتھوں میں آ کے کتنے ہی موتی نکل گئے
میں ڈھونڈتا ہی رہ گیا ہیرے جواہرات

لمحوں کی چیخ سن کے کوئی چونکتا نہیں
کیا مردہ ہو گئی ہیں زمانے کی حسیات

اُلجھی ہوئی زبان ہے، اسلوب بھی عجیب
کیسے سمجھ سکے کوئی اُس کی نگارشات

تارے ہی ٹوٹ کر مری جھولی میں آگریں
اے زندگی کی رات کچھ ایسے بھی حادثات

ہلکی سی موجِ زُلف تہہ و بالا کر گئی
کہنے کو تھی عظیم بہت دل کی کائنات

انجمؔ کہاں جلاتے ہو شعروں کی مشعلیں
اندھوں کا دیش اور یہ تنہا تخیلات

اپنی قسمت کا لکھا کاٹو گے
دوستو کیسے ہوا کاٹو گے

گردنیں کاٹ تو لو گے بیشک
گونجتی ہے جو صدا کاٹو گے!

نوچ کر جلتے چراغوں کی لَویں
کالے پانی کی سزا کاٹو گے

یوں انا کو نہ اُبھارو لوگو
اپنے ہاتھوں سے گلا کاٹو گے

دل میں پھولوں کی تمنا لے کر
کانٹے بوؤ گے تو کیا کاٹو گے

لے کے پھرتے ہو جو مقراضِ حسد
رشتۂ مہر و وفا کاٹو گے

بن کے دیوارِ گلستاں انجم
کیسے تم راہِ صبا کاٹو گے

○

خشک مٹی میں لہو کی جو نمی آئے گی

دیکھنا باغ میں پھر سبز پری آئے گی

کٹ گئی عمر اسی دھن میں سفر کرتے ہوئے

دو قدم اور ابھی چھاؤں گھنی آئے گی

سچّے الفاظ برتنے لگے اشعار میں ہم

اپنے حصّے میں بھی ہیرے کی کنی آئے گی

دم بدم خوں کی روانی میں بھنور پڑتے ہیں

ایسا لگتا ہے کوئی سخت گھڑی آئے گی

دیکھ کر سختیٔ حالات گماں ہے انجم

اپنے بعد آئے گی جو نسل جری آئے گی

★

بارش نہ سہی ابر کا سایہ بھی بہت ہے
صحرا سے سمندر کا یہ رشتہ بھی بہت ہے

اُبھرا ہے جو گلشن میں گل و لالہ کی صورت
یہ خون ہے اور میرا شناسا بھی بہت ہے

ہم شہر میں یونہی نہیں اِتراتے پھرے ہیں
اس میں کسی مہ وش کا اشارا بھی بہت ہے

اک روپ میں ڈھلنے کیلئے صدیاں بھی کم ہیں
ذہنوں میں سما جائے تو لمحہ بھی بہت ہے

اک اور تماشا چلو دُنیا کو دِکھا دیں
مدت سے صلیبوں کا تقاضہ بھی بہت ہے

انجم کے یہ جوہر یونہی چمکے نہیں یارو!
اک شوخ نے نظروں سے تراشا بھی بہت ہے

★

ہے یقیں مجھ کو مرے خون کی قیمت دے گی
یہ شہادت مری، اِس دور کو عزّت دے گی

روز ٹوٹے گا کوئی عضوِ بدن کا تیرے
اور کیا اس کے سوا تجھ کو رعونت دے گی

اپنی پہچان کے اوصاف مقرّر کر لو
یہ صدی روز ہی تم کو نئی صورت دے گی

جانے کیوں مجھ کو گماں ہوتا ہے آئندہ صدی

بے خد و خال سے چہروں کو شباہت دے گی

تم نے بھی دیکھا ہے، کیچڑ میں کنول کھلتے ہیں

کیوں نہ پھر گردِ سفر منزلِ راحت دے گی

ہم بھی اتریں گے کسی روز بدن میں اپنے

زندگی گر ہمیں کچھ دیر کو مہلت دے گی

شہر میں رہنا ہے انجم تو سنبھالو لہجہ

ورنہ یہ شوخی بلاوجہ عداوت دے گی

○

○

حیراں ہوں نصیب کی بخشش کو دیکھ کر
سائے سے اپنے، دھوپ میں محروم ہیں شجر

قبضے میں اپنے ہوتی فضاؤں کی مملکت
اڑتے اگر ہواؤں کی رفتار دیکھ کر

اُن سے ملے تو خود سے بھی پہچان ہو گئی
ورنہ ہم اپنی ذات سے ابتک تھے بیخبر

ہر ٹکڑے میں بس ایک ہی تصویر پاؤ گے
دیکھو تو اپنی ذات کا آئینہ توڑ کر

نشتر سے لوگ کرتے ہیں زخمِ جگر رفو
یہ رسم تو کہاں سے چلی میرے چارہ گر

انجمؔ زمیں سے جن کی جڑیں رشتہ توڑ لیں!
دیکھا ہے سب نے سوکھ کے گرتے ہیں وہ شجر

★

کسے گماں تھا اِس طرح وہ سزا دے گا
سمجھ کے ہم سے یہ دُنیا ہمیں مٹا دے گا

کہاں اُلجھتے ہو، اس سے بڑی سزا دے گا
کہ دُور رہ کے بھی نزدیک سے صدا دے گا

بُرا نہ مانو تو پتھر بچھا دو راہوں میں
جو سر اُٹھا کے چلو گے تو فائدہ دے گا

ستارہ کوئی جبیں پر سجالو دیوانو!
اندھیرے غاروں میں رہنے کا حوصلہ دے گا

زمیں کے دام سے بچ بھی گئے تو کیا حاصل
ابھی وہ زیست کا اک اور سلسلہ دے گا

سبھی ہیں اُلجھے ہوئے اپنی ذات میں انجم
تمہیں بتاؤ تمہیں کون آسرا دے گا

★

○

دُنیا، یا آسمان والے ہیں
رستے سب امتحان والے ہیں

ہم سے پوچھو مزاج بارش کا
ہم جو کچّے مکان والے ہیں

اپنی خاطر یہ جشنِ دار و صلیب
جیسے ہم آسمان والے ہیں

پھانس چبھنے سے درد ہوتا ہے

ہم بھی تو جسم و جان والے ہیں

کشتیاں پھونک دیں جو ساحل پر

ہم اُسی خاندان والے ہیں

قوم، مذہب، وطن، ضمیر، لہو!

لوگ اُونچی دکان والے ہیں

خود پہ قابو رکھو میاں انجمؔ

اور بھی آن بان والے ہیں

○

مناظر میں بلا کی دل کشی ہے
مگر یہ آنکھ ہے جو دُکھ رہی ہے

بشارت کی ابھی پہلی گھڑی ہے
یہ دُنیا کیوں پیمبر مانگتی ہے

غنیمت ہے کہ اتنے بوجھ پر بھی
زمیں آہستہ سانسیں لے رہی ہے

بنے ہیں موم سے خوابوں کے پیکر

ہر اک تحریر پانی پر لکھی ہے

چراغوں کے بدن جھلسے ہوئے ہیں

سحر کی آرزو مہنگی پڑی ہے

ہزاروں بُت بلندی سے گرے ہیں

مگر اب تک دماغوں میں کجی ہے

یہ تحفہ عہدِ زرّیں کا ہے انجم

جواں بالوں سے چاندی جھانکتی ہے

○

○

اپنی ہستی مُنتشر اجسم نہ رنگ و بُو میں رکھ
لے اُڑے گی یہ ہوا، خود کو ذرا قابُو میں رکھ

ڈھونڈتا کیوں ہے خس و خاشاک کی تُو بستیاں
آگ ہی رکھنی ہے گر بُجھتے ہوئے پہلو میں رکھ

ایک تو بخشا ہے تُو نے خاک کا یہ پیرہن
پھر تقاضہ ہے کہ اس کو آپ کے پہلو میں رکھ

اک ذرا سی آنچ پر دیوانہ ہو سیماب سا

اِس قدر تیکھی ادا بہتے ہوئے لوہو میں رکھ

چاند کا رتھ مانگتی ہے ملکۂ سیّارگاں!

اور ہوا کہتی ہے ظالم خواہشیں قابو میں رکھ

بیکراں ہو جائے گا تیری اَنا کا دائرہ

ہو سکے خود کو ہوا میں، رنگ میں، خوشبو میں رکھ

زرد ہوتی جا رہی ہیں مُسکراتی صورتیں

گلبدن کچھ رنگ اپنا عارض و گیسو میں رکھ

○

منزل کا کچھ پتہ نہیں لیکن للک کے ساتھ
چلتے ہی جا رہے ہیں مسافر ٹرک کے ساتھ

پیکر پگھل رہے ہیں اندھیروں کی آنچ سے
جاری ہے ایک سخت تصادم فلک کے ساتھ

لیکن صدف کی پیاس کا عالم وہی رہا
برسی گھٹا ہزار گرج اور چمک کے ساتھ

کیا کیا اُمنگیں لاتا ہے موسم شباب کا
بَل کھا رہی ہے گاؤں کی گوری دھنک کے ساتھ

یادوں کی شوخ تتلی کے پر نوچ ڈالئے
پاگل اُڑا کرے گی گُلوں کی مہک کے ساتھ

کوئی لچک نہ تھی مرے فرمانِ قتل میں
قانون گرچہ بنتا ہے انجم لچک کے ساتھ

☆

○

کیا میں رُوحِ جہاں سے ناواقف

آسماں، آسماں سے ناواقف

مجھ پہ تُہمتاں کیوں لگاتے ہو؟

میں خود اپنے زیاں سے ناواقف!

جل رہا ہوں چراغِ شب جیسا

میں مکاں، لامکاں سے ناواقف

کشتیاں ساحلوں کی فکر میں گُم

اور ہوا بادباں سے ناواقف

اپنے ماضی سے کون بات کرے

سب کھنڈر کی زباں سے ناواقف

نیزہ نیزہ نزول سورج کا!

پاؤں جائے اماں سے ناواقف

★

○

اب زرد لبادے بھی نہیں خشک شجر پر

جس سمت نظر اٹھتی ہے بے رنگ ہے منظر

اترے ہیں مری آنکھوں میں جلووں کے صحیفے

خوابوں کا فرشتہ ہوں میں غزلوں کا پیمبر

بیتے ہوئے لمحوں سے ملاقات اگر ہو

لے آنا ہوا ذرا اک بار مرے گھر

اتراؤ نہ مستی میں جواں سال پرندو

پروائی کے جھونکوں سے بھی کٹ جاتے ہیں شہپر

آجاتے ہیں جب بھی تری خوشبو کے بلاوے

پیچیدہ سوالات کیا کرتا ہے بستر

★

سنبھل نہ پائے ندی کے بہاؤ پر ہم لوگ
سوار جیسے تھے کاغذ کی ناؤ پر ہم لوگ

زمانہ سر پہ ہمارے بھی تاج رکھ دیتا
جو بہہ نکلتے ہوا کے بہاؤ پر ہم لوگ

ہمیں کو پھول نہ مل پائے اس مدھوبن کے
نثار ہو گئے جس کے رچاؤ پر ہم لوگ

سُنا! تمہاری حرارت اسے بھی لے ڈوبی
ملے تھے پہلے پہل جس تلاؤ پر ہم لوگ

بھڑکتی پیاس کا شاید یہی تقاضہ تھا
کہ رکھ دیں اپنی زبانیں الاؤ پر ہم لوگ

★

زرد موسم کے اک شجر جیسی
ساری بستی ہے میرے گھر جیسی

جب بگڑتا ہے وقت انساں کا
چھپکلی لگتی ہے مگر جیسی

سانس، جیسے سفر میں ہے راہی
اپنی کایا ہے رہ گذر جیسی

چھوٹ جاتا ہے رنگ چھونے سے
خواہشیں، تتلیوں کے پر جیسی

اور کیا ہم غریب رکھتے ہیں
ایک دولت ہے بس ہُنر جیسی

زندگی آج کے زمانے میں!
بحرِ ظلمات کے سفر جیسی

ہے ضمیر اور جسم میں انجم
کشمکش، کشتی اور بھنور جیسی!

○

○

شدّت بہت ہے دھوپ کے تیور سنبھالئے
شبنم سی رُوح، موم سا پیکر سنبھالئے

دنیا کا رنگ رُوپ نہ محور سنبھالئے
دیواریں ہل رہی ہیں ذرا گھر سنبھالئے

آسائشوں کے پیڑ نہایت بلند ہیں
پھل چاہئے تو ہاتھ میں پتھّر سنبھالئے

آئینہ دیکھ دیکھ کے سر پھوڑتے ہیں لوگ
اِن پاگلوں کے درد کو کیونکر سنبھالئے

ہم وہ شجر ہیں چاٹ گیا جس کو آفتاب
اب کیا بدلتے رنگوں کا منظر سنبھالئے

مٹّی کا جسم دے دیا اچّھا کیا، مگر
کس طرح ہر قدم پہ سمندر سنبھالئے

انجم جو ان آنکھیں بھی بینائی کھو چکیں!
اب کس سے کہئے راہ کے پتّھر سنبھالئے

○

سچ کہنے پر زباں کٹی رُسوا کئے گئے
ہم لوگ کیسے دور میں پیدا کئے گئے

آنکھوں کو پھوڑ لیں گے وہ خود اپنے ہاتھ سے
یارو پُرانے لوگ جو زندہ کئے گئے

ہوتا جو دن تو صحرا بھی ہم کو قبول تھا
افسوس یہ ہے رات کو بینا کئے گئے

اک پنجۂ ہوس نے کھُرچ ڈالے وہ نقوش
صدیوں میں جو لہُو سے ہویدا کئے گئے

انجمؔ صلیب و دار پہ کھینچا گیا جنہیں
مارے گئے وہ لوگ کہ زندہ کئے گئے!

★

○

زرد پتّوں پہ مرا نام لکھا ہے اُس نے
سبز خوابوں کا یہ انجام لکھا ہے اُس نے

کوئی مِلتا نہیں جو پڑھ کے سُنا دے مجھ کو
برگِ گُل پر کوئی پیغام لکھا ہے اُس نے

سچ ہے تنہائی میں انسان سنک جاتا ہے
روزِ روشن کو سیہ فام لکھا ہے اُس نے

مہر و مہ، دیپ، ہوا، ابر، سمندر، خوشبو
کس کی تقدیر میں آرام لکھا ہے اُس نے

سر اُچھلتے ہیں، زباں کٹتی ہے جس میں انجم
میرے ذمّے وہی اک کام لکھا ہے اُس نے

★

حوصلہ دل کا ڈوبتا دیکھوں
کیا رہا زندگی میں کیا دیکھوں

تُو نے کیا لکھ دیا مقدر میں
جانے والوں کا راستا دیکھوں

جی سکو گے مرے دماغ کے ساتھ
تم میں ہے کتنا حوصلا دیکھوں

آج میرے بھی ہاتھ پھیلے ہیں
کون ہے درد آشنا دیکھوں

دھوپ اُترے گی میرے آنگن میں
ہو گا کس دن یہ حادثہ دیکھوں

کیسے آنکھوں میں نور اُترے گا
سب کو خوابوں میں مُبتلا دیکھوں

آنکھیں پہچانتا ہوں لوگوں کی
کس توقع پہ آئینہ دیکھوں

کیا سُناؤں کوئی حسین غزل
چہرے چہرے پہ مرثیہ دیکھوں

اتنی چھوٹی سی عمر میں انجم
کتنی صدیوں کا حادثہ دیکھوں

○

دیکھا تھا میں نے کس نے جلایا مرا مکاں
آنکھوں میں پھیر دی گئیں جلتی سلائیاں

لو نہ بجھتے ہی وہ کونسی شے تھی جو جل اٹھی
کیوں دیر تک چراغ سے اٹھتا رہا دھواں

دیکھا ہے کس نے وقت گذرتا ہے کس طرح
لیکن وہ چھوڑ جاتا ہے چہروں پہ داستاں

بہتر ہے کاٹ دو یہ ہیولوں کا سلسلہ
گذریں گے میرے بعد تمہارے بھی کارواں

وہ شعر لکھے جاتے ہیں خط میں بنامِ حُسن
جن کے لئے فگار ہوئیں میری اُنگلیاں

یارب مری زباں، مرے ہاتھوں کی خیر ہو
لکھنے لگا ہوں میں بھی حکایاتِ خونچکاں

انجم شجر سے برگ بچھڑتا ہے جب کوئی
سُنتا ہوں دیر تک میں ہواؤں کی سسکیاں

○

دل پریشاں سہی، راتیں ہی سہانی دیتا
بیتے ادوار کی اتنی تو نشانی دیتا

سرو کو تُو نے گھنی چھاؤں نہ بخشی یا رب
کیا ضروری تھا کہ پوشاک بھی دھانی دیتا

تم تو رکھتے تھے زبانوں پہ چراغوں کی لویں
کون پھر میری حمایت میں زبانی دیتا

آئینے ہی نے اگر مجھ کو سنبھالا ہوتا
میں بھی دُنیا کو اک اچھی سی کہانی دیتا

بھیجتا تھا جو دہکتے ہوئے موسم میں مجھے
میری وحشت کو بھی بھرپور جوانی دیتا

میرا ہر شعر ہے انجمؔ مرے چہرے کی طرح
اِس سے بہتر تمہیں کیا اپنی نشانی دیتا

★

○

کیا خبر تھی یہ دن کبھی دیکھیں گے
خون بوئیں گے صبر کاٹیں گے

کس کو مُنصف کہیں کسے قاتل؟
بچ رہے کل تلک تو سوچیں گے

"میں" اگر یوں ہی سر اُٹھاتا رہا
لوگ اپنے ہی بُت کو پُوجیں گے

آپ اپنا بھی جائزہ لے لیں
ہم تو اپنی سزا کو پہنچیں گے

قوم، مذہب، زمیں، رنگ، زباں
یونہی کب تک لکیریں کھینچیں گے

کیا تمہیں بھی گُمان تھا انجم
ہم خود اپنے بدن کو نوچیں گے

★

○

رتجگے چھین لے آنکھوں کی جلن لے جائے

کوئی آ کے مری صدیوں کی تھکن لے جائے

حادثہ کاش تجھے ایسا بھی پیش آئے کوئی

جو ترے ماتھے کی اک ایک شکن لے جائے

تیرے ہونے سے ہر اک چیز کشش رکھتی تھی

اب زمیں کھینچ لے کوئی کہ گگن لے جائے

روزنِ دیدۂ انساں میں جڑی ہیں کیلیں

دل میں کیسے کوئی سورج کی کرن لے جائے

نرم الفاظ ہیں تاثیرِ جراحت انجمؔ

کاش کوئی ترے لہجے کی چبھن لے جائے

★

○

ایک ہی پیڑ تھا تپتے ہوئے صحراؤں میں
حوصلہ ٹوٹ گیا جس کی گھنی چھاؤں میں

شہر تک جاتے ہی کھو جاتے ہیں رستے سارے
کون آئے گا کشش کیا ہے یہاں گاؤں میں

رہ کے لوگوں میں گناہوں کے سوا کیا ملتا
کاٹ دی عمر بھلے ہم نے تپسیاؤں میں

مطمئن ہو نہ سکا چارہ گروں سے شاید
وہ بھی شامل ہوا اب میرے مسیحاؤں میں

جانے کیا بات ہے یہ پیاس بجھاتے ہی نہیں
آگ سی آگ نظر آتی ہے دریاؤں میں

زخم کھا کر بھی طبیعت نہیں رکتی انجم
پھول گولر کا ہے کیا دل کی تمناؤں میں

★

○

میں چُپ ہوں اور دُنیا سُن رہی ہے
خموشی داستانیں بُن رہی ہے

تعجب ہے کہ اک سونے کی چڑیا
بیابانوں میں تنکے چُن رہی ہے

کہاں نیکی، گناہوں سے ہی بچ لیں
ہمیں تو بس یہی اک دُھن رہی ہے

تجھے محسوس کرتے بھی تو کیسے؟
چھٹی حس بھی ہماری سُن رہی ہے

میں اُس بستی کا باشندہ تھا یارب
جہاں سچّائی بھی اَوگُن رہی ہے

یہاں گردش میں ہیں دن رات انجم
وہاں بس اک صدائے کُن رہی ہے

★

جاگتی آنکھوں سے ہر لمحہ اک ہی سپنا دیکھ رہا ہوں
خاموشی کے جنگل میں آواز کا رستہ دیکھ رہا ہوں

صدیوں سے یہ کھیل ہے جاری پت جھڑ پت جھڑ بادل بادل
سبز اُجالوں پر اب بھی میں پیلا سایہ دیکھ رہا ہوں

موسم، دھرتی، شیشہ، پتھر، سورج، کرنیں، جنگل، پنچھی
اپنے اندر قید ہوں لیکن ساری دُنیا دیکھ رہا ہوں

بہتر ہے مٹی کو اپنی کوئی سجیلا پیکر دے دوں
دھیرے دھیرے گھوم رہا ہے عمر کا پہیہ دیکھ رہا ہوں

جس کے ذرّے ہیرے انجمؔ جس کی گلیاں پھولوں کی بستی
اپنے ہاتھوں جل جائے گا، شہرِ تمنّا دیکھ رہا ہوں!

★

○

کیا ہوا کہہ گئی خدا جانے
پھول پتّے بہت اُداس ملے

اپنی آنکھوں میں روشنی بھر لو
کون جانے کہاں پہ شام ملے

رات خوابوں کے دیپ لائی تھی
صبح اپنے بدن پہ داغ ملے

رنگ ہو ایک جس کی مٹی کا
شاید ایسی زمیں خلاؤں میں ملے

پھول سانسوں کے احتیاط سے چوم
پھر یہ موسم کبھی ملے نہ ملے

ہم ہی پتھر تھے ساتھ نبھ نہ سکا
یوں تو شیشہ بدن ہزار ملے

دوستوں کا خلوص ہے انجم
ایک مدت ہوئی ہے خود سے ملے

اب اس سے بڑھ کے سزا دیگا کیا زمانہ مجھے
مرے مزاج کا اب تک کوئی مِلا نہ مجھے

ابھی تو زخم بہت ہیں زمیں کے سینے میں
تُو آسماں کے سپنے ابھی دِکھا نہ مجھے

مری متاعِ سخن دہر کی امانت ہے
نہ تول پائے گی میزانِ تاجرانہ مجھے

ترے قریب تو نہیں کوئی ٹوکنے والا
ادب سے دیکھ ذرا چشمِ کافرانہ مجھے

بکھرتے لوگ یہ قدروں کا ٹوٹنا انجم
لگا رہے ہیں ہر اک لمحہ تازیانہ مجھے

★

○

میں سوچتا تو ہوں لیکن یہ بات کس سے کہوں

وہ آئینے میں جو اُترے تو میں سنور جاؤں

خود اپنے آپ سے وحشت سی ہو رہی ہے مجھے

بچھڑ کے تجھ سے میں اک مستقل عذاب میں ہوں

ہر ایک لمحہ بھنور ہے، ہر ایک پل طوفاں

کہاں تک اور میں ساحل کی جستجو میں بڑھوں

مرے وجود نے کیا کیا لباس بدلے ہیں!

کہیں چراغ، کہیں راستے کا پتھر ہوں

ہوا کے دوش پہ ہوں مثلِ برگِ آوارہ

اب اور کیا کہوں انجم میں اپنا حالِ زبوں!

★

اُٹھاؤ سنگ، کہ ہم میں سکت بہت ہے ابھی
ہمارے گرم لہو میں نمک بہت ہے ابھی

اُتر رہی ہے اگر چاندنی، اُترنے دے
مہکتی زلف میں تیری چمک بہت ہے ابھی

یہ کل کسی نئے موسم کی فصل کاٹیں گے
سروں میں اہلِ جنوں کے ٹھنک بہت ہے ابھی

اسے خبر نہیں سورج بھی ڈوب جاتا ہے

حسیں لباس پہ نازاں دھنک بہت ہے ابھی

ہمارے پہلے ہی موسم نے ہم کو توڑ دیا

مگر تمہارے بدن میں لچک بہت ہے ابھی

ہوائے وقت نے جھونکی ہے دھول آنکھوں میں

ہماری آنکھ میں لیکن چمک بہت ہے ابھی

دل اپنا ان کی ہتھیلی پہ رکھ بھی دے انجم

ترے خلوص پہ یاروں کو شک بہت ہے ابھی

خود بھی بن جاتی ہیں بِپھرا ہوا بادل آنکھیں
دیکھ لیتی ہیں سمندر میں جو ہلچل آنکھیں

تِتلیاں اُڑ گئیں خوابوں کی شبستانوں سے
اب بھی رنگوں میں ہیں کھوئی ہوئی پاگل آنکھیں

اِتنی غفلت نے مناظر ہی بدل ڈالے ہیں
بند کر لیں تھکے ہارے نے جو اک پل آنکھیں

اتنا گستاخ زمانہ نہ ہوا تھا پہلے
ڈالے رہتی ہیں سدا اشکوں کے آنچل آنکھیں

میر و غالب نے تو کاجل کے مزے لوٹ لئے
بھول بیٹھی ہیں مرے دور میں چھل بل آنکھیں

خواب میں بھی تو وہی غار نظر آتے ہیں
اور کیا خاک دکھائیں گی یہ بوجھل آنکھیں

اپنا جلتا ہوا گھر دیکھ رہا ہوں انجم
ہائے کیا ڈھونڈ رہی تھیں مری پاگل آنکھیں

بڑے حسین و دل آویز خواب مانگے ہے
عجیب شخص ہے، ناحق عذاب مانگے ہے

وہی ہوا، وہی موسم، وہی فضا کب تک
نگاہِ شوق کوئی انقلاب مانگے ہے

وہ محفلیں ہوں کہ تنہائی، احتیاط رکھو
قدم قدم پہ زمانہ حساب مانگے ہے

ورق ورق ہوا جب انتشار آمادہ
وہ پھول رکھنے کو میری کتاب مانگے ہے

یہ کس طلسم سے چہرہ بگڑ گیا انجم
ہمارا آئینہ ہم سے جواب مانگے ہے

★

نہ ہوتا دہر سے جو بے نیاز کیا کرتا
کھلا تھا مجھ پہ کچھ ایسا ہی راز کیا کرتا

مریضِ کشمکشِ جبر و اختیار میں تھا
علاجِ جذب و کشش چارہ ساز کیا کرتا

ترے کرم نے تو دنیا ہی سونپ دی تھی مجھے
بچا کے کچھ نہ رکھا حرص و آز کیا کرتا

بگڑ گیا مرا حلیہ تو بر ہمی کیسی
تھے رہ گزر میں نشیب و فراز کیا کرتا

مجھے خبر تھی کہ میں بھی ترے سبب سے ہوں
پھر اپنی ذات پہ میں فخر و ناز کیا کرتا

تمام عمر رہے پہریدار کاندھوں پر
ترے خلاف اے انجم نواز کیا کرتا

*

○

رہوں گا زندہ، جو بکھرا ابھی ریزہ ریزہ بدن
تمہیں خبر نہیں یارو کہ میں ہوں شیشہ بدن

ہوس نے توڑ دیئے کتنے چاند کتنے صنم
تمام لوگ لئے پھرتے ہیں کھنڈر سا بدن

مجھے خوشی ہے کہ احساس تو سلامت ہے
ہوا نے چھین لیا گرچہ مسکراتا بدن

بہت ستاتا ہے بھیگے نشیلے موسم میں
وہ رنگ روپ میں مدہوش وہ دھنک سا بدن

خیال آئے تو جیسے کھنک اُٹھیں گھنگھرو
شبِ وصال وہ انگڑائیوں میں ڈوبا بدن

اسے بھی ہو گیا احساس اپنے ہونے کا
بس ایک بار نگاہوں سے چھو لیا تھا بدن

سیاہ راتوں میں یاد آتا ہے بہت انجم
وہ جگمگاتا سراپا، وہ آئینہ سا بدن!

کچھ ایسے کرب میں اپنی حیات گذری ہے
کسی مریض پہ جس طرح رات گذری ہے

یہ بات یاد رہے، غسلِ آفتابی میں
ہزاروں دیپ جلے ہیں تو رات گذری ہے

تمہارا ذہن ہی زخمی نہیں ہے خوابوں سے
ہر ایک ذہن پہ یہ واردات گذری ہے

وہ اک شجر کہ جو رسوائیوں کا باعث تھا
اُسی کے کرب میں ساری حیات گذری ہے

وہ آئے لوٹ کے انجم تو کوئی بات بنے
جو ذات مجمعِ حسنِ صفات گذری ہے

★

چکرا رہے ہیں دہر میں بے نور زاویئے

سورج کو اب صلیب سے نیچے اُتاریئے

پہلے خود اپنی ذات میں غوطہ لگایئے

پھر شوق سے جناب سمندر کھنگالیئے

بھٹکا ہے جب سے کرب کے جنگل میں آدمی

کتنے بدل گئے ہیں نگاہوں کے زاویئے

لمحات پر ہے برف کی چادر پڑی ہوئی

جی چاہتا ہے برف پہ شعلے سجایئے

سہلایئے گا بیٹھ کے تلوے کہاں تلک

کانٹے سے کیوں نہ پاؤں کا کانٹا نکالیئے

انجم گذارنی ہے یہاں کتنی زندگی

کیا خوشنما اُمیدوں کا میلا لگایئے

٭

کسے خبر تھی کہ آنکھوں کا خواب ٹوٹے گا
مرے وجود پہ ایسا عذاب ٹوٹے گا

نہ اُلٹو کل کے دل آویز و خوشنما اوراق
وگرنہ آنکھوں پہ ہر شب عذاب ٹوٹے گا

ابھی بدن کی سجاوٹ پہ خوب اِترالو
ہنسو گے خود پہ جو زورِ شباب ٹوٹے گا

چلو سنبھل کے، اندھیرا بہت ہی گہرا ہے

بڑھو، کبھی تو کرن کا نقاب ٹوٹے گا

ہمارے ماتھے سے پھوٹے گی روشنی کی کرن

زمیں کے سینے پہ جب آفتاب ٹوٹے گا

اسی اُمید پہ اُلجھے ہیں اپنے آپ سے ہم

کبھی تو سلسلۂ پیچ و تاب ٹوٹے گا

ہر ایک شعر میں زندہ رہوں گا میں انجم

بلا سے جسم مثالِ حباب ٹوٹے گا

O

پرچھائیں سے بھی اپنی ابھی ڈر رہا ہوں میں
انجان راستوں پہ سفر کر رہا ہوں میں

وہ دن بھی کیا عجیب تھے جب اس کے واسطے
پت جھڑ میں بھی بہار کا منظر رہا ہوں میں

کوتاہ قد تھے لوگ تو شکلیں عجیب تھیں
جب تک کہ اپنے خول کے اندر رہا ہوں میں

یوں بے سبب تو قتل کی سازش نہیں ہوئی
سرمد کے "ننگ و نام" کی چادر رہا ہوں میں

آشفتگی کو چھوڑ مرا حوصلہ تو دیکھ
تا زندگی ہواؤں کی زد پر رہا ہوں میں

میری بساط کیا تھی مگر اس کے باوجود
انجم مزاجِ وقت کا تیور رہا ہوں میں

*

○

تیشہ بدست آ مرے آذر، تراش دے
بے ڈول ہے بہت مرا پیکر تراش دے

گر قمریوں کے نغمے گراں بار ہیں تجھے
اس رُت میں سارے سرو و صنوبر تراش دے

یوں اُڑ گئی ہے بوئے وفا اُس کی ذات سے
جس طرح کوئی شاخِ گُلِ تر تراش دے

اُڑنا اگر ہے بادِ مخالف کا دھیان رکھ
ایسا نہ ہو کہ تیز ہوا پر تراش دے

کیا موم کے بدن کی حقیقت ترے لئے
تُو چاہے تو نگاہوں سے پتھر تراش دے

٭

اے مصوّر مرے افکار کو پیکر دے دے
دیدہ و دل میں اُتر جائے وہ منظر دے دے

میں بتاؤں کہ ہے شیشوں کی جوانی کتنی
کوئی اک بار مرے ہاتھوں میں پتّھر دیدے

رُوح کا چین کہاں، زر کے سیہ خانوں میں
دیکھ شاید تجھے یہ چیز قلندر دے دے

میری بستی میں بکھر جائے گا شیشوں کا امام

لوگ سنگین ہیں پتھر کا پیمبر دے دے

پھر سیہ رات کے ماتھے سے سحر پھوٹے گی

مشعلیں ہاتھ میں اور پاؤں میں چکر دیدے

رات کی پیاس کو ہے قطرۂ شبنم کافی

کون کہتا ہے کہ تو سارا سمندر دے دے

جب ہر اک جسم پہ ہوتا تھا اسی کا چہرہ

چشمِ انجم کو وہ کھویا ہوا منظر دیدے

لگے ہے پھر کسی سورج کا انتظار سا ہے
جو دُور آگ سے روشن دُھواں سا اُٹھتا ہے

اسے بتاؤ کہ اندھے ہیں لوگ بستی کے
جو شخص راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہے

پنپ سکا نہ کوئی پودا اُس کی بانہوں میں
بلند پیڑ ہے کتنا مگر اکیلا ہے

ہر ایک رشتے سے بڑھ کر ہے درد کا رشتہ

کہیں بھی چوٹ لگے عضو عضو دکھتا ہے

نئیں بدن کی سکڑتی ہی جا رہی ہیں مگر

سہانے خوابوں کی آنکھوں میں ایک دنیا ہے

عجیب ڈھنگ سے چہرے بدل گئے سب کے

کہ اپنا چہرہ بھی اب اجنبی سا لگتا ہے

ابھی شعور کو پہنچا نہیں ہے دل انجم

کھلونے دیکھ کے اکثر مچلنے لگتا ہے

شام ہوتے ہی سمندر میں اُتر جاتا ہے
کیسا سورج ہے اندھیروں کے نگر جاتا ہے

آئینہ لے کے وہ نکلا تھا اُبھارنے کے لئے
کرچیاں، زخم لئے لوٹ کے گھر جاتا ہے

میں تو سونا ہوں مجھے آگ سے خطرہ کیسا
آگ میں تپ کے مرا حُسن نکھر جاتا ہے

زندہ رہنا ہے تو احساس کو زندہ رکھو

کھو دیا جس نے یہ جوہر وہ بکھر جاتا ہے

اس سے کہہ دو کہ ہے مشرق میں اُجالوں کا نگر

شب کے ڈولے میں یہ مہتاب کدھر جاتا ہے

سوچتا ہی نہیں کیا گذرے گی دیوانے پر

بن کے خوشبو کوئی چُپکے سے گذر جاتا ہے

چل منالیں اُسے، اپنا ہی بھلا ہے انجم

وہ سنورتا ہے تو ہر ذرّہ سنور جاتا ہے

○

یوں تو سامان مسرت کا بہم ہوتا ہے
لیکن اس دور میں یہ حادثہ کم ہوتا ہے

رات بھر جلتے ہیں معصوم چراغوں کے بدن
تب کہیں اک نئے سورج کا جنم ہوتا ہے

اپنی آنکھوں میں حسیں خواب سجانے والو
ٹوٹ جاتا ہے کوئی خواب تو غم ہوتا ہے

آس جب ٹوٹنے لگ جائے حبابوں کی طرح
زندگانی کا وہی موڑ اہم ہوتا ہے

تم بھی کردار ہو انجم اسی افسانے کا
حسن کے نام جو صدیوں سے رقم ہوتا ہے

٭

○

رات خوابوں سے گھر سجاتا ہوں
روز اک اینٹ بیچ آتا ہوں

کل سماتا نہ تھا سمندر میں
آج قطرے میں ڈوب جاتا ہوں

کور دیدہ ہیں سب، چراغ بکف
میں اندھیروں کے زخم کھاتا ہوں

جنگ گھمسان کی ہوئی ہے کوئی
ہر بدن سر بریدہ پاتا ہوں

کتنی مسموم ہے فضا انجم
دانے دانے میں زہر پاتا ہوں

★

○

اپنی ہی ذات سے ٹوٹا مرا رشتہ کیسے
ہو گیا دور مرے جسم سے سایہ کیسے

فصلیں بارود کی استادہ ہیں چاروں جانب
اب صبا لائے گی پھولوں کا سندیسہ کیسے

نور تو چھین لیا تو نے مری آنکھوں سے
عہدِ زریں ترا دیکھوں گا تماشہ کیسے

اس قدر شور کہ اپنی ہی صدائیں گم تھیں

میں تری نرم سی آواز کو سنتا کیسے

وہ سمندر ہے اُتر جاتا ہے سورج اسمیں

خشک صحرا میں ہو کرنوں کا بسیرا کیسے

آئینہ بھی تو ہے بے درد، زباں رکھتا ہے

سخت اُلجھن ہے، چھپاؤں مرا چہرہ کیسے

کر دیئے ہم نے ہی مسدود خلا کے رستے

آسماں سے کوئی اُترے گا فرشتہ کیسے

اب تو باقی نہیں اپنوں میں بھی چاؤ یارو
اپنی لاش اپنے ہی کاندھوں پہ اُٹھاؤ یارو

کل بچھڑ جاؤ گے تو خود سے تو لپکارو گے کسے
اس قدر بھی نہ بدن اپنا سجاؤ یارو

خود جو زخمی ہیں وہ کیا تم کو دلاسہ دیں گے
اپنی رُوداد نہ لوگوں کو سُناؤ یارو

آنے والوں کے لئے باعثِ عبرت ہوگی
اپنی تصویر کو البم میں سجاؤ یارو

قلبِ انساں پہ کوئی نقش اُبھارو اپنا
صرف کاغذ پہ نہ تصویر بناؤ یارو

صرف انجم کے خد و خال پہ نظریں کیوں ہیں؟
آئینہ خود کو بھی اک روز دِکھاؤ یارو

*

○

پھولوں کی تباہی پہ گلا کاٹ رہا ہوں
ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہوں

شاید اسی صورت ہو کرن کوئی فروزاں
احساس کی تاریک ردا کاٹ رہا ہوں

جس کیلئے رگ رگ سے لہو پھوٹ بہا ہے
اُس دور میں جینے کی سزا کاٹ رہا ہوں

میں قید ہوں اپنے ہی بنائے ہوئے گھر میں
اک جیل ہے جو سب سے جُدا کاٹ رہا ہوں

کب تک بھلا اُمّید کے سائے میں گذر ہو
انجم پرِ پروازِ ہُما کاٹ رہا ہوں

★

ہر ایک دور میں یہ تماشا کیا گیا
سُوکھے بدن سے خوں کا تقاضا کیا گیا

آنکھیں تھیں جن کی راہ رَوؤں کیلئے چراغ
ہیرا دکھا کے اُن کو بھی اندھا کیا گیا

اُس نے ہی میرے قتل کی تجویز پیش کی
جس پر تمام عمر بھروسا کیا گیا

لکھے گا یہ بھی کل کا مورّخ کہ اس جگہ
اپنوں کا گھر جلا کے اُجالا کیا گیا

اُس وقت بھی جنوں کا وہی بانکپن رہا
جب قاتلوں سے زیست کا سودا کیا گیا

نفرت سی اب تو ہونے لگی اپنی ذات سے
اک زندگی کے واسطے کیا کیا کیا گیا

انجمؔ سے نیکیوں کا بھی مانگا گیا حساب
محشر میں بھی غریب کو رسوا کیا گیا

○

اب کہاں رات میں مستی رہی جادو جیسی
چاندنی پھرتی ہے بھٹکے ہوئے آہو جیسی

در پہ ادراک کے آ کے بکھر جاتی ہے
میرے اندر بھی کوئی چیز ہے خوشبو جیسی

ڈوب جائے گی کہاں کوئی بھروسہ ہی نہیں
نبضِ دنیا ہے لرزتے ہوئے آنسو جیسی

آدمی اپنی طبیعت ہی سے کھاتا ہے شکست
ورنہ آنکھیں تو سبھی کی ہیں ترازو جیسی

پاس آتے نہیں سہمے ہوئے چہرے انجم
روشنی دل میں لئے پھرتا ہوں جگنو جیسی

★

O

اپنی تباہیوں کا پتہ دیجئے کیسے

معصوم تو سبھی ہیں سزا دیجئے کیسے

زہریلے ہیں دماغ، زبانیں ہیں آگ کی

ایسے میں زندگی کی دُعا دیجئے کیسے

تحت الثریٰ میں رہتے ہیں کچھ آسماں پہ لوگ

ویران بستیاں ہیں صدا دیجئے کیسے

ہلکی سی رَو، وجود کو کرتی ہے تہہ نشیں

جذبوں سے کھیلنے کی ادا دیجئے کیسے

انجم یہاں شعاعوں سے جل اُٹھتے ہیں بدن

جلتا ہوا "انا" کا دِیا دیجئے کیسے !

☆

○

راستہ اس کے سوا اور نہ سُوجھے کوئی
جان پہچان کی دیوار گرا دے کوئی

اِن میں دُکھ درد کے چہروں کے سوا کچھ بھی نہیں
بند کر دے مرے ماضی کے دریچے کوئی

اختیارات یُوں لوگوں میں ہوئے ہیں تقسیم
جیسے نابینا کے ہاتھوں میں "دیا" دے کوئی

لوگ پانی میں یہاں آگ لگا دیتے ہیں
آگ بجھتے ہوئے سورج کی بڑھا دے کوئی

اختلافات سے رنگین ہے دنیا، انجم!
اِس کے بارے میں غلط رائے نہ رکھے کوئی

★

○

نرغے میں خواہشات کے یوں تنگ ہے حیات

لگتا ہے جیسے دستِ تہہِ سنگ ہے حیات

ہے ایک ہی خمیر مگر کس قدر تضاد

شیشہ کہیں ہے اور کہیں سنگ ہے حیات

دل ہے بجھا ہوا تو قیامت ہے زندگی

دل میں شگفتگی ہے تو گلرنگ ہے حیات

شوخی حنا کی، دل کا لہو، گیسوؤں کی شام

حاصل نہیں یہ رنگ تو بے رنگ ہے حیات

انجمؔ ہمیں سبب ہیں، ہمیں ہیں گناہ گار

رونا فضول ہے کہ بڑی تنگ ہے حیات

★

انسان کو انسان نے اس طرح ڈسا ہے
ہر کوئی سمندر کی طرف بھاگ رہا ہے

سچائی کا اک لفظ جو آجائے زباں پر
لگتا ہے کہ ہونٹوں پہ کوئی پھول کھلا ہے

ہر چہرے میں جب اپنا ہی چہرہ نظر آئے
سمجھو کہ نئے دور کے قدموں کی صدا ہے

کاغذ کے مکانوں میں ہو، شعلوں کو نہ چھیڑو!

ظلمت کے خداوندو، بہت تیز ہوا ہے

اب اور نہ زخمی کرو تم اپنی انا کو

بازار میں مرہم ہے نہ زخموں کی دوا ہے

یہ سانحہ اس دور کی تقدیر ہے شاید

انسان خود اپنا ہی گلا کاٹ رہا ہے

جو رات چراغوں کا لہو پیتی ہے انجمؔ

سورج نے ہمیشہ ہی اُسے قتل کیا ہے

○

○

بدل گئی ہیں جو قدریں کسی سبق کی طرح
سماج ہو گیا بوسیدہ سے ورق کی طرح

ہمارے ہاتھوں نے دُنیا کو رنگ بخشا ہے
کہیں پہ خواب کی صورت، کہیں شفق کی طرح

کھنچیں گے دار پہ یا ہوں گے زینتِ منبر
اُبھر رہے ہیں جو انساں صدائے حق کی طرح

مری حیات مُزیّن ہے تیری چاہت سے
کسی کتاب کے دلکش سرِ ورق کی طرح

یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی انجم
خوشی ملے بھی تو محسوس ہو قلق کی طرح

★

بھلا کے اس کو ہر انساں عجیب موج میں ہے
بدن کی ناؤ تنفّس کے سیلِ موج میں ہے

خبر کرو کہ قلم بن گئی ہر اک انگلی
انگوٹھا کاٹ کے میرا، زمانہ موج میں ہے

میں عسکری ہوس کو شکست کیسے دوں
کہ اک حلیف کی صورت یہ میری فوج میں ہے

فلک پہ جا کے ستاروں کی طرح ٹوٹ گیا
میں بےخبر تھا کہ پستی بھی میرے اوج میں ہے

★

○

فضائیں گھل گئیں خوابوں کی ہر دھنک آخر
مجھے پھر اور دکھائی بھی کیا سنک آخر

کہیں کسی نئے موسم کی ابتدا تو نہیں
دل و دماغ میں ہوتی ہے کیوں ٹھنک آخر

اُفق لہو ہے، فضائیں لہو، زمیں لہو
اب اور کیا مجھے دِکھلائے گی سنک آخر

مجھے یہ ڈر ہے سرابوں کا راستہ نہ کھلے
مرے ہی در پہ اُبھرتی ہے کیوں چھنک آخر

زباں کا تو الگ مسئلہ رہا انجم
سوال بن گئی لہجوں کی بھی کھنک آخر